افضال ریحان

## امت کی اصل ضرورت

# تشخص یا اشتراک

فرد ہو یا تنظیم، قوم ہو یا مذہب، بلاشبہ اس کا تشخص ہی اُس کی جان وایمان اور پہچان ہوتی ہے۔ تشخص ختم کرنے کا مطلب ہوگا کہ اس شخص، ادارے یا مذہب وملت کی جان نکال دی گئی ہے۔ معلوم انسانی تاریخ کے آغاز ہی سے انسانوں کے نام، اُن کی پہچان یا انفرادی تشخص کا نشان رہے ہیں۔ خاندان وہ پہلا ادارہ تھا جو معرض وجود میں آیا، مابعد نسلی بنیادوں پر قبائل تشکیل پائے یا ذات برادریاں معرض وجود میں آئیں، تو ان سب کو اپنے تشخص کی بڑی فکر ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں باضابطہ شادی کے بغیر مرد اور عورت کے جنسی تعلقات، چاہے وہ چھپی رضامندی سے ہی قائم ہوئے ہوں، شدید ترین جرم رہا ہے، اور اس جرم کی سزائیں بھی ایسی ہی شدید تھیں، جذبہ محرکہ یا نفسیاتی عامل خاندان یا قبیلے کا تشخص تھا، گناہ کرنے والا گویا خاندان یا قبیلے پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس کے وجود کی پاکیزگی کو مٹا دینے والے عمل کا آغاز کرتا ہے، جو قبیلہ جتنا طاقتور ہوتا تھا، اپنے تشخص پر اتنا ہی اترانا اپنا حق ہی نہیں فرض بھی سمجھتا تھا۔ مذہب چونکہ ابتدائے آفرینش سے انسانی زندگی کا حصہ رہا ہے، اس لئے اس کی جو بھی شکل تھی وہ قبائل کی نسلیت کے بین بین رہی، ہر نسلی گروہ یا قبیلے کا اپنا دیوتا، دیوی یا قابل پرستش ہستی تھی۔ بائبل کے ”عہد نامہ قدیم“ میں جس طرح ہم ”خدائے اسرائیل“ کا ذکر بار بار دیکھتے ہیں، اسی طرح یونانیوں اور قدیم مصریوں کے نسلی دیوی، دیوتاؤں کی داستانیں بھی ہم اُن کی قدیم تواریخ میں پڑھ سکتے ہیں، ہندوازم میں بھی اس نوع کی نسلی بنیادوں پر مذہبی تقسیم ہم گیتا یا ویدوں میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

ان سب کو اپنے اپنے تشخص کی فکر دامن گیر رہتی تھی، ہم دیکھتے ہیں، جوں جوں انسانوں میں اشتراک بڑھا، دیوی، دیوتاؤں میں بھی اس یکجہتی کے مظاہر سامنے آئے۔ بائبل کے ''عہد نامہ جدید'' میں اگرچہ ہم سیدنا مسیح کو یہ کہتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ: ''میں تو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیں تلاش کرنے آیا ہوں''..... لیکن پولس نے اقوامِ دیگر کو بھی روحِ مقدس کا ہمنوا بنانے کے لئے خداوند کا کلام پہنچانے کی راہیں کھول دیں، مگر مسیحیت کے صلیبی تشخص پر کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا گیا۔ خود پیغمبر آخر الزماں ﷺ کو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک وقت تھا جب انہیں اپنے اولین مخالفین سرداران قریش مکہ کے بالمقابل اپنے تشخص کو اجاگر کرنے کی

> آج بین الاقوامی سطح پر انسانی معاشرہ شعور کی اس سطح پر آچکا ہے، جہاں مذہبی، نسلی، لسانی یا جنسی تعصّبات بڑی حد تک دب چکے ہیں یا اچھے خاصے کمزور پڑ چکے ہیں۔

ضرورت تھی، تو آپ ﷺ نے قبائلی دیوتاؤں لات منات، ہبل وعزیٰ وغیرہ کی مخالفت کرتے ہوئے خدائے واحد کی وحدت پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، جبکہ قریش مکہ کے بالمقابل آپ ﷺ نے اہل کتاب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اشتراک رکھا۔ ہجرت کے بعد ''میثاق مدینہ'' کی تاریخی دستاویز کو ہم اس تناظر میں دونوں پہلوؤں سے دیکھ سکتے ہیں، ''میثاق مدینہ'' میں یہود کو مسلمانوں کے ساتھ ملاتے ہوئے ''امتِ واحدہ'' یعنی ایک قوم قرار دے دیا گیا۔ ریاست مدینہ کے اس اولین مبارک دور کو ہم وطنی قومیت یا Nation State کی ایک خوبصورت مثال قرار دے سکتے ہیں۔

طویل 13 سالوں پر محیط نبوت کے مکی دور میں ہم یہ منظر ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ مشرکین مکہ کے بالمقابل پیغمبر ﷺ اہل کتاب سے اظہار اشتراک کرتے ہوئے مسجد حرام میں اس طرح کھڑے ہوتے کہ خانہ کعبہ ہی نہیں بیت المقدس بھی قبلہ کی حیثیت سے رخِ مبارک کے سامنے رہے۔ قرآن میں نہ صرف یہ آیت مقدسہ موجود ہے کہ ''فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ''..... ترجمہ: ''جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اہل کتاب سے پوچھ لیا کرو'' (نحل:43)..... بلکہ آنجناب ﷺ کا تعامل یہ رہا کہ جہاں قرآنی ہدایت موجود نہ ہوتی، وہاں اہل کتاب سے رجوع فرماتے۔ لیکن ایک وقت وہ بھی آیا، جب یہود کے بالمقابل اپنا الگ تشخص منوانا یا نمایاں کرنا مطلوب تھا، تو زلفوں کی مانگ یا مونچھوں کی تراش خراش بھی اس انداز میں کرنے سے انکار کر دیا، جس انداز میں یہود کرتے تھے، تب ہمیں من تشبه بقوم فهو منهم کے الفاظ بھی مل جاتے ہیں، اور یہ خواہش ایسی بڑھی ہوئی نظر آتی ہے کہ عمر فاروقؓ جیسے انتہائی قابلِ اعتماد ساتھی کو صحائفِ قدیم (تورات کے اوراق) پڑھتے دیکھ کر چہرۂ انور سرخ ہو جاتا ہے۔

ہجرت کے بعد جب اسلام اپنے ابتدائی مراحل میں تھا اور اس کے پیروکاران کو اپنے اولین مخالفین سے سخت خطرات درپیش تھے تو ہم تشخص و اشتراک کا خوبصورت اختلاف بھی دیکھتے ہیں، اور اختلاط و امتزاج بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں، باہمی اتفاق کے لئے ایک طرف مواخات ہے، دوسری طرف اجتماعی تحفظ و تعاون کے لئے ''میثاق مدینہ'' ہے، لیکن اپنے پیروکاران کی انفرادی مذہبی پہچان کا بھی پورا خیال ہے۔ عبادت کے لئے اپنے لوگوں کو مسجد میں بلانے کے طریق کار پر بحث ہو رہی ہے، تو تجویز آتی ہے کہ مسجد میں گھنٹیاں بجا کر لوگوں کو بلاوے کی خبر کی جائے، جواب ملتا ہے کہ یہ تو یہود کا خاص مذہبی نشان ہے، پھر تجویز آتی ہے کہ آگ جلا کر اطلاع کر دی جائے، جواب ملتا ہے کہ یہ تو مجوسیوں کا خاص شعار ہے، کیونکہ اس نئی تشکیل پانے والی تحریک تنظیم یا جماعت کو اپنی الگ مذہبی پہچان کروانی وقت کا ضروری تقاضا ہے، اس لئے دعوت کا اسلوب بھی الگ سے ہونا چاہیے، سو باہمی مشاورت سے بلندی پر کھڑے ہو کر پکارنے یعنی اذان دینے پر اتفاق کر لیا جاتا ہے۔ ایک وقت میں سیدنا عمرؓ کے تورات پڑھنے پر شکایت ہوتی ہے، تو دوسرے وقت میں قدیمی آسمانی کتب کو سمجھنے کے لئے زید بن ثابتؓ جیسے قابل صحابی کو عبرانی زبان سیکھنے کی ہدایت فرمائی جا رہی ہے۔ عاشورہ کے روزے کی خوبصورت مثال بھی اس حوالے سے پیش کی جا سکتی ہے۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ کے استفسار پر یہود کی طرف سے یہ بتایا جاتا ہے کہ اس روز سیدنا موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تھے تو فرمایا کہ موسیٰ پر ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان کی اس خوشی میں شامل ہوں لیکن اپنے متبعین کو اس زبردست اشتراک پر ابھارتے ہوئے ساتھ ہی اپنے تشخص کی غرض سے یہ بھی فرمایا کہ تم دسویں کے ساتھ نویں کا روزہ بھی رکھا کرو۔ ہم پیغمبر ﷺ کے اس جذبہ اشتراک کو دوہری خوشی کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اپنی زوجہ محترمہ سیدہ صفیہؓ

کو ''یہودیہ'' کا طعنہ ملنے پر تشفی کا کیا خوب اسلوب ہے، فرماتے ہیں تم انہیں کہو تمہاری محض ایک نسبت ہے پیغمبر سے، جبکہ میری تین نسبتیں ہیں، ابراہیمؑ میرے باپ ہیں، تو موسیٰؑ و ہارونؑ میرے بھائی اور محمدؐ میرے خاوند یعنی تشخص اور اشتراک ساتھ ساتھ چلتے ہیں، حالات کی مطابقت میں جہاں جس چیز کو نمایاں یا کم تر کرنے کی ضرورت ہے، وہ کر لیا جاتا ہے، فی نفسہ تشخص کی گردان بالذات وہ بنیادی مسئلہ نہیں ہے، جس کی آگ میں آج ہم مسلمان اپنی ساری صلاحیتیں اور وسائل جھونک رہے ہیں۔ تشخص قائم رکھتے ہوئے بھرپور اشتراک بھی کیا ہے جو بعض اوقات سیاسی ادغام کی حد تک پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے، جسے میثاق مدینہ میں ''امۃ واحدہ'' کی اصطلاح کا استعمال ہونا۔ مسلم یہود متحدہ قومیت کا یہ پیغمبری نظریہ جدید وطنی و سیاسی قومیت کی غیر معمولی بنیاد یا مثال ہے، ہمیں افسوس ہے کہ مابعد امہ نے اس فکر اشتراک و اتحاد پر کما حقہ توجہ نہیں دی اور سارا زور تشخص پر ڈالے رکھا۔

آج دنیا بھر کے مسلمان مسلم تشخص کے حوالے سے بری طرح فکری انتشار اور ابتری کا شکار ہیں، انہیں ہر پل یہ فکر دامن گیر ہے کہ کہیں بین الاقوامی اشتراک ان کے تشخص کو کھا تو نہیں جائے گا۔ قیام پاکستان کے عوامل میں ہندو بنیاد پرستی کی تنگ نظری کے بین بین ایک عامل مسلم تشخص کے حوالے سے ہمارا یہ خوف بھی تھا، اور اب پاک ہند دوستی کی رکاوٹوں میں ایک بڑی رکاوٹ بھی، یہ خوف ہی ہے..... بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے اس نادیدہ اندرونی خوف سے آج اقوام عالم بالعموم اور اقوام مغرب بالخصوص سخت مضطرب و پریشان ہیں۔ انہیں بجا طور پر یہ شکایت ہے کہ ''کم آمیز ہے مومن'' مسلمان ہر معاملے میں اپنے تشخص کا مسئلہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں، کبھی حجاب ایشو بنا ہوتا ہے تو کبھی لباس اور کبھی مساجد کے میناروں کو مسلم تشخص کی علامت قرار دے کر احتجاج شروع کر دیا جاتا ہے۔

آج بین الاقوامی سطح پر انسانی معاشرہ شعور کی اس سطح پر آ چکا ہے، جہاں مذہبی، نسلی، لسانی یا جنسی تعصبات بڑی حد تک دب چکے ہیں یا اچھے خاصے کمزور پڑ چکے ہیں، جس طرح انفرادی طور پر ایک معقول شخص سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کا بُرا چاہے بغیر اپنی بھلائی کا سوچے، اس طرح اجتماعی طور پر ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنے مفادات کی فکر کرے۔ ایک زمانہ تھا جب دنیا میں وسائل لوٹنے کے علاوہ اپنے مذاہب کو غالب کرنے یا اپنے نظریات دوسروں پر مسلط کرنے کے لئے کشت و خون کی ندیاں بہا دی جاتی تھیں۔ مذاہب کے معتبر نام پر لڑی جانے والی مقدس جنگوں میں جو لوٹ مار روا رکھی گئی ہے اور آزاد انسانوں کو جس طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جاتا رہا ہے وہ انسانی تاریخ کا دردناک اور شرمناک باب ہے، آج ان مذاہب کے پیروکار ان بھی اپنے بڑوں کے کرتوتوں پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے طرح طرح کی توجیہات پیش کرتے یا معافیاں مانگتے دکھائی دیتے ہیں۔ بلاشبہ دوسروں کے وسائل لوٹنے پر جنگیں آج بھی ہو رہی ہیں۔ غلبہ و استیلاء کی حیوانی خواہش ہنوز ختم نہیں ہو سکی ہے، لیکن اگر ہم حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں تو ان جنگوں کے محرکات و عوامل میں اپنے تشخص کی برتری کا زعم اور دوسروں سے اسے منوانے کا داعیہ سب سے بڑا محرک ہے۔

آج پوری مہذب دنیا مذہبی دہشت گردی کے لگائے ہوئے زخموں سے چور ہے، خودکش حملوں کا خوف مغرب و مشرق کی شہری معاشروں پر

عفریت بن کر منڈلا رہا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس انتہا پسندی، دہشت گردی اور تباہی و بربادی کا باعث کیا ہے؟ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس کی وجہ وہ بے انصافیاں اور زیادتیاں ہیں جو ترقی یافتہ امیر ممالک بالخصوص امریکہ نے مسلمانوں کے ساتھ پیہم روا رکھی ہیں، ان کے وسائل کو لوٹا ہے، فلسطین، کشمیر، چیچنیا اور بوسنیا میں مسلمانوں کے ساتھ طرح طرح کے مظالم روا رکھے گئے ہیں۔ عراق اور افغانستان میں امریکہ جو کچھ کر رہا ہے۔ یہ سب اس کا ردعمل ہے۔ جذباتی پروپیگنڈے کے زور سے مسلم معاشروں میں پھیلائی گئی ان تمام قصے کہانیوں کو ہم لایعنی و بے بنیاد سمجھتے ہیں اور ایک ایک نام نہاد مسئلے پر مباحثہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہماری

نظر میں دہشت گردی کی اس آگ کو دیا سلائی دکھانے کی ایک وجہ مسلم تشخص کے ماند پڑنے کا مبینہ خوف ہے تو دوسری وجہ اپنے اس تشخص کو اقوامِ دیگر پر مسلط کرنے کی تمنا و آرزو ہے۔ اس کے پس منظر میں مسلم بنیاد پرست مفکرین کی کئی دھائیوں پر مبنی نظری و عملی جدوجہد ہے۔ جو اپنی مسلم اقوام کے مذہبی الذہن طبقات کو اس سوچ کے زیرِ اثر شدت پسندی پر اُکساتے رہے کہ اس نظریے کی دعوت کو لے کر اٹھو اور پوری دنیا پر چھا جاؤ۔ یہ ''چھا جانے'' کی حسرت ہے جو ان راسخ العقیدہ مخلص جنگجوؤں کو کسی پل بیٹھنے نہیں دے رہی۔ انہیں مسلسل بتایا جا رہا ہے کہ تم پوری دنیا میں سب سے اعلیٰ و ارفع لوگ ہو تو تم تو پیدا ہی اس لئے ہوئے ہو کہ پوری دنیا کی امامت کرو۔ تمہارے علاوہ دوسری ساری دنیا کافر ہے اور خدا نے یہ کہہ رکھا ہے کہ کفر دب جانے کے لئے ہے اور بالآخر غالب تم ہی رہو

> اپنے تشخص پر قائم رہنا یا اسے قائم رکھنا بری بات نہیں، لیکن مطلوب چیز یہ ہے کہ اپنا تشخص قائم رکھتے ہوئے وسیع تر اشتراک کی راہیں نکالی جائیں۔

گے۔ اب خدا سے سچا وعدہ کس کا ہو سکتا ہے۔ جب راسخ العقیدہ مسلمان جہادیوں نے بظاہر اپنے ہاتھوں افغانستان میں دنیا کی ایک سپر پاور کو پاش پاش ہوتے دیکھا تو دینی جذبے و عزم سے سرشار غیر مرئی خدائی طاقتوں پر عین الیقین رکھنے والے صاحبانِ ایمان یہ کیوں نہ سوچتے کہ وہ دوسری سپر پاور کو بھی تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی عسکری لحاظ سے مضبوط مملکت کا حکمران جو انہی جیسے راسخ مذہبی خیالات کا حامل تھا۔ انہیں اپنا پشت پناہ دکھائی دیتا ہو۔ ہمسائیگی میں ایران جیسے تیل کی دولت والے ملک میں خالص مذہبی لوگوں کی قیادت میں اسلامی انقلاب برپا ہو چکا ہو۔ نصف صدی قبل ایک بڑی مسلم ایمپائر ''سلطنتِ عثمانیہ'' میں خلافت کے خاتمے کا سوز سینے میں دبا ہو۔ ہر مسجد سے مسلم تشخص کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کے نعرے لگ رہے ہوں تو پھر یہ صورت حال کیوں پیدا نہیں ہوگی جو آج پوری دنیا میں ہر ایک کو دکھائی دے رہی ہے۔

ہم مسلم تشخص کی اَن گنت خوبیوں کا اعتراف و اقبال کرتے ہیں اور اس بات کے حریص ہیں کہ دنیا میں پروان چڑھتی عالمی تہذیب میں مسلم تہذیب کو بھی حصہ بقدر جثہ ضرور ملنا چاہیے۔ ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ اقوامِ دیگر میں بحیثیت اقلیت بسنے والے مسلمانوں کے بھی کچھ مسائل ہیں۔ انہیں اپنے اعلیٰ تشخص کی برتری کا احساس ہر دم پریشان رکھتا ہے کہ وہ غیروں کے نیچے دبے ہوئے کیوں ہیں۔ ہمیں کئی ایسے معزز حضرات سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو نصف صدی سے امریکہ و یورپ میں قیام پذیر ہیں۔ اچھی آمدن کے ساتھ وہ وہاں پُرتعیش زندگیاں گزار رہے ہیں۔ اُن کے بچے وہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے ہیں۔ وہاں کے آزاد ماحول میں اپنی مرضی سے شادیاں بھی کر رہے ہیں، لیکن ہمارے یہ دردمند مخلص مسلمان اندر سے دکھی ہیں۔ انہیں یہ درد سوہانِ روح محسوس ہوتا ہے کہ ان کے بچے اپنا اسلامی تشخص کھو رہے ہیں۔ انہیں یہ دکھ ہے کہ مغربی معاشروں میں اسلامی تہذیب کو برتر و اعلیٰ مقام حاصل کیوں نہیں ہے، جس کی یہ تہذیب ان کی نظر میں، حقدار ہے۔ انہیں یہ دکھ ہے کہ وہاں نام نہاد بے حیائی و فحاشی ہے۔ کئی مقامات پر انہیں نسلی امتیاز کا شکار بنایا جاتا ہے اور انہیں دہشت گرد کہہ کر ان کی تضحیک کی جاتی ہے۔ ہمیں انتہائی رازدارانہ انداز میں وہ یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ اگرچہ ہم نصف صدی سے مغرب میں رہ رہے ہیں۔ وہاں کی شہریت بھی لے چکے ہیں، لیکن الحمدللہ ہم اپنے مذہب، اپنے کلچر، اپنے ملک کو نہیں بھولے ہیں۔ ہم آج بھی کافروں سے نفرت کرتے ہیں۔ امتِ مسلمہ کے درد میں ہمارے دل آج بھی دھڑکتے ہیں۔ اپنے وطن کی محبت اور اپنے برتر مسلم تشخص کو وہ آج بھی حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔ اس کے بالمقابل اہلِ مغرب کو ان سے یہ شکایت ہے کہ دیگر آبادکاروں کی طرح مسلمان آبادکار مغرب میں تمام مساوی سہولیات سے مستفید ہونے کے باوجود ہمیں اور ہمارے معاشرے کو غیریت سے دیکھتے ہیں۔

جن معزز خواتین و حضرات کی تین تین چار چار نسلیں وہاں پروان چڑھ چکی ہیں۔ وہ بھی ہمارے معاشرے میں شامل ہو کر اس کا کامل حصہ بننے سے انکاری ہیں۔ ہر پل انہیں اپنے الگ اور منفرد تشخص کی فکر دامن گیر رہتی ہے، بلکہ بعض میں تو ایسی شدت ہوتی ہے کہ وہ ہمارے لبرل و آزاد معاشرے کو اپنے مذہبی و تہذیبی افکار کے مطابق ڈھالنے کے متمنی ہو جاتے ہیں۔ چاہے اس سلسلے میں انہیں جبر ہی سے کام کیوں نہ لینا پڑے یا تشدد پر ہی کیوں نہ اُترنا پڑے۔ مغرب کی مساجد میں مسلم ممالک سے جو آئمہ تشریف لے جاتے ہیں وہ بھی عامۃ المسلمین کو اسی نوع کی انتہا

پسندی کا اسلام پڑھاتے اور تشدد پر اکساتے ہیں۔

ہماری نظر میں اپنے تشخص پر قائم رہنا یا اسے قائم رکھنا بری بات نہیں، لیکن مطلوب چیز یہ ہے کہ اپنا تشخص قائم رکھتے ہوئے وسیع تر اشتراک کی راہیں نکالی جائیں۔ اگرچہ اشتراک کے معنی ادغام کے نہ لئے جائیں۔ پروردگار عالم نے ہر انسان کو دوسرے سے الگ بنایا ہے فرد کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مشرق و مغرب میں کہیں کوئی اختلاف نہیں ہے..... ''ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ''..... اس طرح گروہی طور پر بھی کسی تنظیم، ادارے، طبقے، تہذیب یا مذہب کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی انفرادی پہچان کو قائم رکھتے ہوئے دیگر گروہوں، تہذیبوں یا مذاہب سے اشتراک کرے۔ ہمارے شاعر مشرق نے اسی مثبت جذبے کو اس فرد، ادارے یا تہذیب کے لئے ''خودی'' کا نام دیتے ہوئے ''اپنی خودی پہچان'' پر زور دیا ہے۔ علاوہ ازیں اقبال نے مسلم تشخص و قومیت کو زمانے بھر میں منفرد پہچان کا حامل ٹھہراتے ہوئے کہا ہے: خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ''

ہماری نظر میں یہاں اقبالؒ کو یہ امتیاز ضرور روا رکھنا چاہیے تھا کہ کیا ''مسلم قومیت'' کی ترکیب میں کسی نوع کا مذہبی و سیاسی تفاوت بھی موجود ہے یا نہیں؟ کیونکہ جہاں مذہبی حوالوں سے انفرادی پہچان کی گنجائش نظر آتی ہے۔ وہیں سیاسی حوالوں سے ''میثاق مدینہ'' ایسے کسی بیجا امتیاز کی نفی کرتا یا اس کی گنجائش نکالتا دکھائی دیتا ہے۔ میثاق مدینہ کے تحت سیاسی طور پر متحدہ قومیت کے نظریے کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ (بحوالہ سیرۃ ابن ہشام، جلد 2 ص 322) جنوبی ایشیا کے خصوصی حالات میں چونکہ ہمیں ایک الگ ملک مطلوب تھا۔ اس لئے متحدہ سیاسی قومیت کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا گیا، حالانکہ بہت سے مذہبی طبقات اس کی حمایت میں دلائل دے رہے تھے جبکہ دیگر 57 مسلم ممالک میں چونکہ ہمیں ایسی ناگزیر مجبوری نہیں ہے۔ اس لئے مذہبی عقیدے کی حامل ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ'' ہوتے ہوئے ہم نے الگ الگ سیاسی قومیتوں کی گنجائش نکال رکھی ہے۔

پاکستان کے حوالے سے بھی قیام پاکستان کے فوری بعد قائداعظمؒ نے وطنی سیاسی قومیت کو اپنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ نہ صرف دہلی میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہوئے آئے تھے کہ ''وہ ہماری طرف دیکھنے کی بجائے اپنے ملک ہندوستان کے وفادار رہیں'' بلکہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں اپنے اولین صدارتی خطاب میں صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ ''اب یہاں نہ ہندو، ہندو رہیں گے اور نہ مسلمان، مسلمان۔ مذہب کے حوالے سے نہیں کہ وہ ہر شخص کا ذاتی و نجی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی مفہوم میں، مملکت کے شہری کی حیثیت سے..... ذاتی طور پر آپ کا جو بھی عقیدہ ہے، امور مملکت میں اس کا کوئی سروکار نہیں ہے''۔

آج دنیا بھر کے مسلمان جو غیر مسلم ریاستوں میں ان کے شہری کی حیثیت سے زندگیاں گزار رہے ہیں۔ وہ اسی اصول کی روشنی میں غیر مسلم ریاستوں کی قوتیں حاصل کئے ہوئے ہیں۔ اس سے مسلم تشخص کا نہ تو خاتمہ ہو رہا ہے اور نہ ہی اقوام دیگر کے ساتھ اس کا ادغام ہوا ہے البتہ اشتراک کی فضا پروان چڑھ رہی ہے۔ ہماری نظر میں آج کی دنیا کو تشخص و انفرادیت پر زور آزمائی جاری رکھنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اشتراک پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ صرف مسلم تشخص کو نہیں بلکہ دنیا بھر کے تمام مذاہب اور تہذیبوں کو بھی انہی خطوط پر آگے بڑھنا ہوگا۔ اسی سے دنیا میں نہ صرف یہ کہ ایک عالمی تہذیب پنپ سکتی ہے بلکہ عالمی امن اور بھائی

مسلم شناخت تفریح میں حائل نہیں

چارے کی مطلوبہ فضا انسانیت کو میسر آسکتی ہے۔ اسلام کی دعوت بنیادی طور پر قومیت کی نہیں انسانیت کی دعوت ہے۔ اسلام اپنی فطرت میں زیادہ سے زیادہ اشتراک بلکہ وحدت آدم پر یقین رکھتا ہے۔ چاہے اس کے لئے کتنی بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے کئے گئے دوسرے تاریخ ساز معاہدے یعنی ''صلح حدیبیہ'' کی شرائط و احوال سے بھی مختلف النوع روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جسے قرآن نے ''فتح مبین'' قرار دیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ہجرت'' کا سفر اگر مسلم تشخص کا نشان ہے تو ''میثاق مدینہ''، ''صلح حدیبیہ'' اشتراک و وحدت

آدم کی جانب رواں دواں ہونے کا نقطۂ آغاز ہے۔ مسلمانان جنوبی ایشیا نے پاکستان بنا کر اگر اپنا مسلم تشخص منوالیا ہے تو قیام پاکستان کے بعد خطے میں زیادہ سے زیادہ اشتراک بڑھاتے ہوئے سارک کے تحت وہ متفقہ ماحول تشکیل دینے کی ضرورت ہے جو اتنی جنگیں لڑنے کے بعد متحدہ یورپ نے اپنی اقوام کے لئے پیدا کر دیا ہے۔

عالم اسلام کو آج اتنا اعتماد حاصل ہو جانا چاہیے کہ مسلم تشخص کوئی ایسی کمزور چیز نہیں ہے جو کسی کے مٹانے پر مٹ سکے گی وہ اسے لباس، حجاب، یا بود و باش تک محدود کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا پیغمبر اسلام ﷺ کی سرداران قریش سے لڑائی محض ان علامات کو منوانے کے لئے تھی؟ کیا آپ ﷺ انہیں زبردستی کلمہ پڑھانا چاہتے تھے؟...... لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ...... اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ...... کی آزادی تو اسلام میں روز اول سے ہے۔ لڑائی تو قریش مٹے پودوں کو جس ڈھارس کی ضرورت ہوتی ہے مضبوط و توانا درخت اُن سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ جب اسلام مضبوط ہو گیا تو خود پیغمبر اسلام ﷺ بازار سے وہ پاجامہ خرید رہے تھے جو غیر عربی یعنی عجمی تشخص کا نشان تھا۔ ابو ہریرہؓ کی حیرت پر فرماتے ہیں ہاں میں اسے دن کو بھی پہنوں گا اور رات کو بھی، ستر ڈھانپنے کے لئے یہ زیادہ بہتر ہے۔ یعنی انسان بہتری کا جو بھی ذوق رکھتا ہے اس کی مطابقت میں وہ کوئی بھی لباس تراش وضع قطع اختیار کر سکتا ہے بشرطیکہ اس تشخص کا چلن معروف ہو، یعنی عامۃ الناس اس کے لئے جذبۂ تحسین رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو توان کا ابدی تشخص روز اول سے یہ بتا دیا گیا تھا کہ...... ''اچھائی (حکمت یا عقل و شعور والی کوئی بھی چیز) تمہاری اپنی گمشدہ متاع ہے، وہ جہاں سے بھی ملے اٹھا لو''...... یہی مسلم تشخص ہے دیگر لایعنی و بے معنی باتیں ہیں۔ مسلمان جس روز قرآن اور



مکہ کے استبداد سے تھی۔ وہ پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین کی مذہبی وفکری آزادی کا حق تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔ جب اس حق کو تسلیم کر لیا گیا تو فوری طور پر انتہائی سخت شرائط کے باوجود صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے پا گیا۔ اس اصول کی روشنی میں آج ہم دیکھیں کہ دنیا کے وہ کون سے معاشرے وممالک ہیں جہاں مذہبی وفکری آزادیوں کے حق کو بنیادی انسانی حقوق کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا رہا ان سے آپ اسلام کی دی ہوئی حدود وشرائط کے مطابق ضرور لڑیں۔ اس تناظر میں مغرب سے مسلمانوں کی لڑائی تو کسی طرح نہیں بنتی ہے۔ جو حضرات اپنے تشخص کی ثابت قدمی کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ کی مانگ یا تراش خراش کا حوالہ دیتے ہیں، وہ انسانی فطرت کا یہ تقاضا بھی پیش نظر رکھیں کہ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ننھے پیغمبر اسلام ﷺ کے پیغام کی روح تک پہنچ جائیں گے۔ اس روز وہ لفظی غلامی کی تنگناؤں سے نکل کر انسانی بھلائی کی سوچ اپنا لیں گے۔ انسانی حقوق، انسانی آزادیاں جمہوری سوچ، لبرل اپروچ، وسیع تر رواداری و برداشت انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ اگر آج کی مہذب دنیا ان اعلیٰ ابدی انسانی اقدار کی مخالف نہیں ہے تو ہماری دنیا سے لڑائی کیا ہے؟ تب ہم مان لیں گے کہ انسانی تشخص ہی دراصل اسلامی تشخص ہے۔ آج دنیا کو نفرت و اختلاف کی نہیں، محبت و اشتراک کی ضرورت ہے ہمارا خدا ایک ہے تو ماں باپ بھی ایک ہے...... ''الخلق عیال الله''...... کے تحت یہی پیغام وحدت ہے اور ''وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد'' ہے۔